باب 12

ترقی پسند دور

اردو ادب میں انقلابی تبدیلیوں کے لحاظ سے بیسویں صدی کی چوتھی دہائی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس دوران ادیبوں کے طرزِ فکر میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ انھوں نے اشرافیہ طبقے کی جگہ غریبوں اور پس ماندہ طبقات کی طرف خاص توجہ دی۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز سے قبل چند نوجوانوں نے 1932 میں 'انگارے' نام سے افسانوں کا ایک مجموعہ شائع کیا جس میں انقلابی فکر نمایاں تھی۔ یہ افسانے اپنی فکر کے ساتھ اپنی زبان اور اسلوب کے اعتبار سے بھی نئے تھے۔ اس کے بعد 1935 میں لندن میں مقیم چند نوجوانوں نے 'انجمن ترقی پسند مصنفین' کی داغ بیل ڈالی۔ بعد ازاں ہندوستان میں 1936 میں باقاعدہ 'انجمن ترقی پسند مصنفین' کا قیام عمل میں آیا جس کے نتیجے میں اس تحریک کے اثرات پورے ملک میں پھیل گئے۔ اردو ادب کی تاریخ میں ترقی پسند تحریک کو نمایاں حیثیت حاصل ہے جس نے بہ یک وقت تمام اصنافِ ادب کو متاثر کیا اور ایسے موضوعات کو بنیاد بنایا جن کا تعلق جدید عہد کے عوامی مسائل سے تھا۔ اسی بنا پر ترقی پسند ادب کا آہنگ بلند اور فکر احتجاجی ہے۔

چوتھی دہائی سے چھٹی دہائی تک کا دور اردو ادب کی تاریخ میں ترقی پسند ادب کے غلبے کا دور رہا ہے۔ ترقی پسند تحریک و فکر سے وابستہ ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کی تخلیقی کاوشوں سے مختلف اصنافِ ادب میں ترقی پسند ادب کا ایک بڑا سرمایہ جمع ہو گیا۔ شاعری ہو یا فکشن یا تنقید، ہر شعبے میں ترقی پسند تخلیق کاروں اور ناقدین کی بڑی تعداد نظر آتی ہے۔ ان میں بہ طور شاعر مخدوم محی الدین، مجاز، فیضؔ، جذبی، علی سردارؔ جعفری، وامقؔ، جاں نثار اخترؔ، احسان دانشؔ، کیفی، ساحرؔ اور مجروحؔ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ فکشن نگار کے طور پر کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، خواجہ احمد عباس، عزیز احمد، رشید جہاں، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، رتن سنگھ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں جب کہ تنقید نگاروں میں مجنوں گورکھپوری، سجاد ظہیر، عبدالعلیم، احتشام حسین، اختر حسین رائے پوری، ممتاز حسین، محمد حسن وغیرہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

نمائندہ شعرا

مخدومؔ محی الدّین (1969-1908): مخدومؔ ان ترقی پسند شاعروں میں شامل ہیں جنھوں نے عملی طور پر بھی اس تحریک کو توانائی بخشی۔ وہ سابق ریاست حیدرآباد کے ضلع میدک میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک مذہبی خانوادے سے تھا۔ تعلیم کے مراحل طے کرنے کے بعد انھوں نے 'مشیرِ دکن'، 'الاعظم' اور 'پیام' جیسے اخبارات میں ملازمت کی۔ کچھ عرصے تک سٹی کالج حیدرآباد میں اردو کے استاد بھی رہے۔ بعد میں ملازمت سے استعفیٰ دے کر مستقل طور پر کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہو گئے۔ اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے انھیں کئی بار قید و بند کی صعوبتیں بھی اٹھانی پڑیں۔ وہ اسمبلی کے ممبر بھی منتخب ہوئے۔

مخدوم عملی سیاست میں داخل ہونے کے بعد ہمیشہ پس ماندہ، مزدور اور غریب طبقوں کی حمایت کرتے رہے۔ انھوں نے حیدرآباد دکن میں جاگیرداری نظام کے خلاف لڑتے ہوئے وہاں کے کسانوں کی قیادت بھی کی۔ مخدومؔ نے 1936 میں حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی۔ ان کی شاعری میں انقلابی تصورات کے ساتھ غنائیت کا رنگ حاوی ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ان کی شاعری انقلاب اور رومان کا سنگم ہے۔ 'چاند تاروں کا بن' اور 'اِک چنبیلی کے منڈوے تلے' ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ نظموں کے علاوہ انھوں نے غزلیں بھی لکھی ہیں۔

ان کا پہلا شعری مجموعہ 'سرخ سویرا' 1944 میں اور دوسرا 'گلِ تر' 1961 میں شائع ہوا۔ 'بساطِ رقص' ان کا کلّیات ہے۔ دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔ تدفین حیدرآباد میں ہوئی۔

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے	سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے
حیات لے کے چلو، کائنات لے کے چلو	چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

مجازؔ (1955-1911): ان کا نام اسرار الحق تھا۔ وہ قصبہ ردولی، ضلع بارہ بنکی، اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر پائی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ چلے گئے اور وہیں سے 1936 میں انھوں نے بی۔اے۔ کی سند حاصل کی۔ اسی زمانے میں وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے اور انھیں اپنے ساتھی شعرا میں بڑی شہرت ملی۔ مجازؔ نے آل انڈیا

ریڈیو، دہلی کے علاوہ ممبئی کے محکمۂ اطلاعات میں بھی ملازمت کی۔ کچھ عرصے تک ہارڈنگ لائبریری، دہلی سے بھی وابستہ رہے۔ رسالہ 'نیا ادب' لکھنؤ سے بھی ان کا تعلق رہا۔

مجاز کا مجموعۂ کلام 'آہنگ' 1938 میں شائع ہوا۔ ان کی شاعری میں انقلاب، رومان اور تغزل کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی اور دونوں میں شہرت حاصل کی۔ نظموں میں 'آوارہ'، 'اندھیری رات کا مسافر'، 'رات اور ریل'، اور 'ترانۂ علی گڑھ' بہت مقبول ہوئیں۔ مجاز کی شاعری میں انقلابی آہنگ ملتا ہے۔ خوب صورت استعارات وتشبیہات ان کی شاعری کی تاثیر میں اضافہ کرتی ہیں۔ ان کی نظموں میں ایک خاص قسم کی غنائیت پائی جاتی ہے۔

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا ‏ ‏ ‏ ‏ تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا، اے شورشِ دوراں بھول گئے ‏ ‏ ‏ ‏ وہ زلفِ پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

فیضؔ (1911-1984) : ان کا نام فیض احمد تھا۔ سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ایک مدرسے میں حاصل کی۔ اسکاچ مشن ہائی اسکول سے میٹرک اور مرے کالج، سیال کوٹ سے انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج، لاہور سے انگریزی میں اور اورینٹل کالج، لاہور سے عربی میں ایم۔اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ امرتسر اور لاہور کے کالجوں میں تدریسی فرائض بھی انجام دیے۔ فیض انجمن ترقی پسند مصنفین کی پنجاب شاخ کے بانی رکن اور ماہنامہ 'ادبِ لطیف' کے مدیر بھی تھے۔ پھر 1942 سے 1946 تک بہ حیثیت لیفٹیننٹ کرنل فوج کے پبلسٹی ڈپارٹمنٹ سے منسلک رہے۔ انھوں نے انگریزی روزنامہ 'پاکستان ٹائمز' کی ادارت بھی کی۔ پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے نائب صدر اور ملک اور بیرونِ ملک مزدور یونین کے رکن بھی رہے۔ راولپنڈی سازش کیس میں انھیں جیل بھی جانا پڑا۔ انھیں مختلف قومی اور بین الاقوامی اعزازات بھی پیش کیے گئے جن میں سوویت روس کا لینن انعام بھی شامل تھا۔

فیضؔ کا پہلا مجموعۂ کلام 'نقشِ فریادی' 1941 میں منظرِ عام پر آیا۔ ان کے دوسرے مجموعے 'دستِ صبا'، 'زنداں نامہ'، 'دستِ تہِ سنگ'، 'سرِ وادیِ سینا'، 'شامِ شہرِ یاراں'، 'مرے دل مرے مسافر' کے نام سے شائع ہوئے۔ 'نسخہ ہائے وفا' ان کا کلّیات ہے۔ 'میزان' فیضؔ کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ 'صلیبیں مرے دریچے میں' خطوط کا، 'متاعِ لوح و قلم'، 'تقاریر کا اور 'مہ وسالِ آشنائی' یادوں اور تاثرات کا مجموعہ ہے۔

فیضؔ کی شاعری رومان اور حقیقت کا سنگم ہے۔ان کی شاعری عشقِ محبوب سے عشقِ وطن اور انقلاب تک کا سفر کرتی ہے۔جس میں غمِ ذات کے مقابلے میں غمِ جہاں کا درد زیادہ ہے۔

'دو عشق'، 'تنہائی'، 'بول'، 'نثار میں تری گلیوں کے...'، 'دستِ صبا'، 'چمک اٹھے ہیں سلاسل'، 'زنداں کی ایک شام'، 'یاد'، 'ملاقات'، 'ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'، 'صبحِ آزادی' اور 'شیشوں کا مسیحا' ان کی اہم نظمیں ہیں۔ان کی غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

نہ سوالِ وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں نہ شکایتیں	ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے
رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام	موسمِ گل ہے تمھارے بام پر آنے کا نام
وہ بات، سارے فسانے میں جس کا ذِکر نہ تھا	وہ بات، اُن کو بہت ناگوار گزری ہے
مقام، فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں	جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

احسان دانشؔ (1982-1911/14) : ان کا نام احسان الحق اور دانشؔ تخلص تھا۔وہ کاندھلہ، ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے۔باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کر سکے لیکن مطالعے کا شوق انھیں بچپن سے تھا۔انھوں نے زندگی کا بڑا حصّہ لاہور میں گزارا۔

احسان دانشؔ کی نظموں میں غریب اور کمزور طبقوں کی زندگی کا عکس نمایاں ہے۔انھوں نے مزدوروں پر بہت سی نظمیں لکھی ہیں، اسی لیے 'شاعرِ مزدور' کے لقب سے جانے جاتے ہیں۔'نوائے کارگر'، 'چراغاں' اور 'آتشِ خاموش' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ان کی زبان سہل اور رواں ہے۔عام بول چال کے لفظوں کو بہت خوبصورتی سے برتتے ہیں۔ان کی نظموں میں 'صبحِ بنارس' اور 'بیتے ہوئے دن' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

کچھ لوگ جو سوار ہیں کاغذ کی ناؤ پر	تہمت تراشتے ہیں ہوا کے دباؤ پر
سورج کے سامنے ہیں نئے دن کے مرحلے	اب رات جا چکی ہے گذشتہ پڑاؤ پر

جذبیؔ (2005-1912): ان کا نام معین احسن تھا۔وہ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔انھوں نے جھانسی، آگرہ، لکھنؤ، دہلی اور علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ابتدا میں بھوپال کے ایک اسکول میں بہ حیثیت مدرّس کام کیا۔ پھر رسالہ 'آجکل'، دہلی سے وابستہ ہوگئے۔ بعدازاں علی گڑھ کے شعبۂ اردو سے منسلک ہوگئے۔ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد علی گڑھ ہی میں مستقل قیام رہا۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔جذبی کو 'امتیازِ میر'، 'غالب ایوارڈ' اور 'اقبال سمّان'

2019-20

سے سرفراز کیا گیا۔ 'فروزاں'، 'سخنِ مختصر' اور 'گدازِ شب' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ 'حالؔی کا سیاسی شعور' ان کا تحقیقی مقالہ ہے۔

جذبی نے ابتدا میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر سماجی اور سیاسی موضوعات پر نظمیں لکھیں۔ انھوں نے غزل اور نظم دونوں میں اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔

زندگی ہے تو بہرحال بسر بھی ہوگی	شام آئی ہے تو آئے کہ سحر بھی ہوگی
جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنّا کس کو تھی	اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنّا کون کرے
کلیاں نہ کھل سکیں تو یہ بادِ سحر کا جرم	خوفِ خزاں کو موردِ الزام کیا کریں

وامقؔ جونپوری (1912/13-1998): ان کا نام احمد مجتبیٰ تھا۔ پیدائش جونپور میں ہوئی۔ وہ عربی، فارسی کے علاوہ سنسکرت پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ انھوں نے وکالت کی تعلیم بھی حاصل کی۔ ان کے کلام کے دو مجموعے 'جرس' اور 'شبِ چراغ' شائع ہوئے۔ انھوں نے سماجی مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ 'بھوکا ہے بنگال' اور 'مینا بازار' ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ وہ گیت نما احتجاجی نظموں کی وجہ سے عوام میں بہت مقبول تھے۔

دست و پا شل ہیں کنارے سے لگا بیٹھا ہوں	لیکن اس شورشِ طوفان سے ہارا تو نہیں
آکے پھر لوٹ چلی کشتیِ دل ساحل سے	پھر کسی موجۂ طوفاں نے پکارا تو نہیں

علی سردار جعفری (1913-2000): ان کا پورا نام علی سردار جعفری تھا۔ ان کی پیدائش بلرامپور (یو۔پی) میں ہوئی۔ دہلی، علی گڑھ اور لکھنؤ میں انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ انگریزی، اردو اور فارسی ادب کا اچھّا مطالعہ تھا۔ طالب علمی کے زمانے ہی میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوگئے تھے۔ کچھ عرصے تک اتر پردیش کی صوبائی شاخ کے سکریٹری رہے۔ 'قومی جنگ'، 'نیا ادب'، 'پرچم' جیسے رسائل میں بھی انھوں نے کام کیا اور انھوں نے 'گفتگو' کے نام سے ممبئی سے ایک سہ ماہی رسالہ جاری کیا تھا۔ ان کا انتقال ممبئی میں ہوا۔

سردار جعفری نے ابتدا میں مرثیے اور افسانے لکھے۔ ان کی تخلیقات میں سب سے پہلے ان کا افسانوی مجموعہ 'منزل' 1939 میں شائع ہوا۔ لیکن ان کا اصل میدان شاعری اور تنقید ہے۔ ان کے شعری مجموعوں میں 'پرواز'، 'خون کی لکیر'، 'امن کا ستارہ'، 'ایشیا جاگ اٹھا'، 'پتھّر کی دیوار'، 'ایک خواب اور'، 'پیراہنِ شرر' اور 'لہو پکارتا ہے'

شامل ہیں۔ 'ترقی پسند ادب'، 'لکھنؤ کی پانچ راتیں'، 'پیغمبرانِ سخن'، 'اقبال شناسی' ان کی نثری تصانیف ہیں۔ ان کی ادبی و سماجی خدمات کے اعتراف میں انھیں متعدد انعامات پیش کیے گئے جن میں ادب کا سب سے بڑا انعام 'گیان پیٹھ ایوارڈ' اور 'اقبال سمّان' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی شاعری جد و جہد اور عملِ پیہم سے عبارت ہے۔ 'نئی دنیا کو سلام' ان کی ایک مشہور ڈرامائی نظم ہے۔ ان کی غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

حکایتیں بھی بہت ہیں شکایتیں بھی بہت	مزہ تو جب ہے کہ یاروں کے روبرو کہیے
ستم کو سرنگوں ظالم کو رسوا ہم بھی دیکھیں گے	چل اے جوشِ بغاوت چل تماشا ہم بھی دیکھیں گے
چاند کے کٹورے سے چاندنی چھلکتی ہے	دل کے سبزہ زاروں میں، پھر بھی اک اندھیرا ہے

جاں نثار اختؔر (1914-1976) : ان کا نام جاں نثار حسین رضوی اور تخلص اختؔر تھا۔ وہ گوالیار میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی۔ علی گڑھ سے ایم۔اے کرنے کے بعد ان کا تقرر وکٹوریہ کالج، گوالیار میں ہو گیا۔ پھر بھوپال کے حمیدیہ کالج میں صدر شعبۂ اردو مقرر ہوئے۔ بعد میں وہ ممبئی چلے گئے اور وہاں فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ جاں نثار اختر کا شمار اہم ترقی پسند شعرا میں ہوتا ہے۔ 'سلاسل'، 'جاوداں'، 'تارِ گریباں'، 'خاکِ دل'، 'پچھلے پہر' اور 'گھر آنگن' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ انھوں نے غزل، نظم، مرثیہ، رباعی اور مثنوی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی مثنوی 'امن نامہ' بھی مشہور ہے۔

جاں نثار اختؔر نے 'ہندوستان ہمارا' کے نام سے قومی اور وطنی شاعری سے متعلق ایک مجموعہ بھی دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ 1974 میں انھیں 'سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ' پیش کیا گیا۔

جب لگیں زخم تو قاتل کو دعا دی جائے	ہے یہی رسم تو یہ رسم اٹھا دی جائے
چلو نہ عشق ہی جیتا، نہ عقل ہار سکی	تمام وقت مزے کا مقابلہ تو رہا
ہم سے بھاگا نہ کرو دور غزالوں کی طرح	ہم نے چاہا ہے تمھیں چاہنے والوں کی طرح
ہم نے انسانوں کے دکھ درد کا حل ڈھونڈ لیا	کیا برا ہے جو یہ افواہ اُڑا دی جائے

اختر الایمان (1915-1996) : اختر الایمان نجیب آباد، ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ ان کی عمر کا ابتدائی حصہ دلّی میں گزرا۔ دلّی کالج سے بی۔اے کرنے کے بعد دلی میں ملازمت کی اور پھر آل انڈیا ریڈیو میں کام کیا۔ اس کے بعد وہ ممبئی چلے گئے جہاں وہ فلموں کے لیے لکھتے رہے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔

اختر الایمان اردو نظم کے ممتاز شاعر ہیں۔ میرا جی اور ن۔م۔ راشد کے بعد جن شاعروں نے اردو نظم کو استحکام بخشا اور اُس کے ارتقا میں نمایاں کردار ادا کیا، اُن میں اختر الایمان کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اختر الایمان کی نظمیں اپنے انفرادی لب و لہجے اور زبان کے مخصوص آہنگ کی بنا پر الگ سے پہچانی جاتی ہیں۔ ان کا ایک خاص وصف ڈرامائی پہلو ہے۔ 'گرداب'، 'تاریک سیّارہ'، 'آب جو'، 'یادیں'، 'بنتِ لمحات' اور 'نیا آہنگ' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ ان کا کلّیات 'سرو ساماں' کے نام سے 1984 میں منظرِ عام پر آیا۔ 'اس آباد خرابے میں' ان کی خود نوشت سوانح ہے۔ اختر الایمان کے چوتھے مجموعے 'یادیں' پر 1962 میں 'ساہتیہ اکادمی ایوارڈ' دیا گیا۔ اس کے علاوہ انھیں 'اقبال سمّان' اور بعض دوسرے اعزازات اور انعامات بھی پیش کیے گئے۔

مجروحؔ سلطان پوری (1915-2000) : ان کا نام اسرار الحسن خاں تھا۔ ان کی پیدائش اعظم گڑھ میں ہوئی، اصل وطن سلطانپور تھا۔ اعظم گڑھ سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے فیض آباد اور الہ آباد گئے۔ انھوں نے تکمیل الطِب کالج، لکھنؤ سے طِب کی سند بھی حاصل کی تھی۔

مجروح نے ترقی پسندی کے اس دور میں بھی غزل کی کلاسیکی روایت سے خود کو وابستہ رکھا جب کہ ترقی پسند شعرا کے اظہار کا خاص وسیلہ نظم تھی۔ مجروح کی غزلوں میں ترقی پسند فکر کی ترجمانی ملتی ہے۔ ان کا مجموعۂ کلام 'غزل' کے نام سے شائع ہوا۔ اُنھیں 'غالب ایوارڈ' اور 'اقبال سمّان' سے بھی نوازا گیا۔ مجروح ایک مقبول فلمی نغمہ نگار بھی تھے۔ ان کا انتقال ممبئی میں ہوا۔ ان کی غزلوں کے نمائندہ شعر دیکھیے:

سر پر ہوائے ظلم چلے، سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہِ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

ستونِ دار پر رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

کیفیؔ اعظمی (1918/24-2002) : ان کا نام سید اطہر حسین رضوی تھا۔ ان کی پیدائش ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مذہبی تعلیم کی غرض سے وہ لکھنؤ کے ایک مدرسہ میں داخل کیے گئے۔ ان کا شمار ممتاز ترقی پسند شاعروں میں ہوتا ہے۔ کیفی کمیونسٹ پارٹی کے ایک سرگرم رکن بھی تھے۔ ان کی شاعری میں سماجی مسائل کی ترجمانی ملتی ہے۔ 'تبسّم'، 'حوصلہ'، 'پامسٹ'، 'پشیمانی'، 'عورت' اور 'سپردگی' وغیرہ ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ وہ ایک معروف فلمی نغمہ نگار بھی تھے۔ 'جھنکار' اور 'آخرِ شب' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ 'کیفیات' کے نام سے ان کا کلیات بھی شائع ہو چکا ہے۔

ان کی مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں ملینیم ایوارڈ (Millenium Award) اور دیگر دوسرے اعزازات بھی پیش کیے گئے۔ ان کی وفات ممبئی میں ہوئی۔

جنگل کی ہوائیں آ رہی ہیں	کاغذ کا یہ شہر اُڑ نہ جائے
سب اپنے پاؤں پہ رکھ رکھ کے پاؤں چلتے ہیں	خود اپنے دوش پہ ہر آدمی سوار سا ہے

ساحؔر لدھیانوی (1921-1980) : ان کا نام عبدالحئی تھا۔ وہ لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ بی۔ اے کرنے کے بعد انھوں نے لاہور کے مشہور رسالے 'ادبِ لطیف' اور 'سویرا' کی ادارت کی۔ کچھ عرصہ وہ 'شاہراہ' دہلی سے بھی وابستہ رہے۔ اس کے بعد روزگار کی تلاش میں ممبئی پہنچے اور فلموں کے لیے گیت لکھنے لگے۔ یہاں وہ ایک کامیاب نغمہ نگار ثابت ہوئے۔ ساحؔر کا شمار اہم ترقی پسند شاعروں میں ہوتا ہے۔ انسان دوستی ساحؔر کی شاعری کا بنیادی وصف ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں بھی ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کی ہے۔

ان کے شعری مجموعے 'تلخیاں'، 'آؤ کہ خواب بنیں' اور فلمی گیتوں کا مجموعہ 'گاتا جائے بنجارا' کے نام سے شائع ہوا۔

محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے	زمانے اب تو خوش ہو زہر یہ بھی پی لیا میں نے
انھیں اپنا نہیں سکتا مگر اتنا بھی کیا کم ہے	کہ کچھ مدّت حسیں خوابوں میں کھوکر جی لیا میں نے
اے غمِ دنیا تجھے کیا علم تیرے واسطے	کن بہانوں سے طبیعت راہ پر لائی گئی

سلاؔم مچھلی شہری (1921-1973) : ان کا نام عبدالسلام تھا۔ وہ قصبہ مچھلی شہر، ضلع جون پور، اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی کی لائبریری میں ملازمت کی۔ بعد میں آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سے بہ حیثیت پروڈیوسر وابستہ ہوگئے۔ اپنی رومانی نظموں میں انھوں نے جدّت طرازی کی بہت اچھی مثالیں پیش کی ہیں۔ گفتگو کے انداز اور ڈرامائی عناصر کے استعمال سے انھوں نے اپنی بعض نظموں کو افسانے کی طرح دل چسپ بنا دیا ہے۔ انھوں نے نظم میں ہیئت کے کئی تجربے کیے۔ 'میرے نغمے'، 'پایل' اور 'وسعتیں'، ان کے شعری مجموعے ہیں۔ انھوں نے گیت آمیز زبان بھی کامیابی سے استعمال کی اور گیتوں کے عمدہ نمونے بھی پیش کیے ہیں۔

سلام مچھلی شہری کو ان کی ادبی وشعری خدمات کے اعتراف میں حکومتِ ہند نے 'پدم شری' کے اعزاز سے نوازا۔ ان کا انتقال دہلی میں ہوا۔

اس دور کے دیگر اہم شعرا میں شمیم کرہانی، روش صدیقی، سکندر علی وجد، غلام ربانی تاباں اور نشور واحدی شامل ہیں۔

نمائندہ فکشن نگار

کرشن چندر (1914-1977) : ان کی پیدائش وزیرآباد (پاکستان) میں ہوئی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم کشمیر میں حاصل کی۔ بعد میں لاہور سے ایم۔اے اور ایل ایل۔ بی کے امتحان پاس کیے۔ کچھ عرصے تک وکالت کی اور درس وتدریس سے بھی وابستہ رہے۔ ریڈیو اسٹیشن کی ملازمت بھی کی۔ ان کی عمر کا بڑا حصہ ممبئی میں گذرا۔ انھوں نے فلموں کے لیے کہانیاں اور مکالمے بھی لکھے۔ ان کا انتقال ممبئی ہی میں ہوا۔

کرشن چندر نے افسانوں اور ناولوں کے علاوہ ڈرامے، رپورتاژ اور طنزیہ مضامین بھی لکھے لیکن انھیں مقبولیت ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ملی۔ ترقی پسند تحریک سے گہری وابستگی تھی۔ ان کے افسانوں کے مجموعوں میں 'ان داتا'، 'زندگی کے موڑ پر'، 'نظارے'، 'اجنتا سے آگے'، 'میں انتظار کروں گا' اور 'سمندر دور ہے'، بہت مقبول ہوئے۔ کشمیر کی شادابی، فطرت کا حسن اور مظلوموں اور سماج کے دبے کچلے طبقات کی زندگی کے مسائل ان کے افسانوں کے خاص موضوعات ہیں۔ ناولوں میں 'شکست'، 'ایک گدھے کی سرگزشت'، 'جب کھیت جاگے'، 'باون پتّے'، 'میری یادوں کے چنار'، 'ایک عورت ہزار دیوانے'، 'الٹا درخت' کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ ان کا ڈراما 'دروازے کھول دو' بہت مشہور ہے۔ کرشن چندر نے 'پودے' کے علاوہ دو اور رپورتاژ لکھے۔ ان کے طنزیہ مضامین کا مجموعہ 'ہوائی قلعے' کے نام سے شائع ہوا۔ وہ ایک صاحبِ طرز فکشن نگار ہیں۔ ان کی تخلیقات میں حقیقت اور رومانیت کا امتزاج پایا جاتا ہے۔

خواجہ احمد عباس (1914-1987) : خواجہ احمد عباس پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق الطاف حسین حالی کے خاندان سے تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد انھوں نے اعلیٰ تعلیم مختلف شہروں میں حاصل کی۔ وہ 1935 میں ممبئی چلے گئے اور انگریزی اخبار 'بامبے کرانیکل' میں ملازم ہو گئے۔ انھوں نے 1942 میں فلمی دنیا کے لیے

ایک کہانی 'نیا سنسار' لکھی جسے بامبے ٹاکیز نے فلمایا تھا۔ انھوں نے فلموں کے لیے نہ صرف کہانیاں لکھیں بلکہ فلمیں بھی بنائیں۔ اس کے علاوہ انگریزی اخبار 'بلٹز' اور اس کے اردو ایڈیشن کے لیے 'آخری صفحہ' کے عنوان سے مستقل کالم لکھتے رہے۔

'ایک لڑکی'، 'پاؤں میں پھول'، 'زعفران کے پھول' اور 'دیا جلے ساری رات' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ خواجہ احمد عباس کے افسانوں کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک صحت مند معاشرے کی جستجو نظر آتی ہے۔ 'انقلاب' ان کا ایک مشہور ناول ہے۔

عزیز احمد (1978-1914): عزیز احمد کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی۔ وہیں تعلیم بھی حاصل کی۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ انگلینڈ چلے گئے۔ وہاں ترقی پسند مصنفین کے کئی جلسوں میں شریک ہوئے۔ وہ ترقی پسند نظریات کے زبردست حامی تھے۔ افسانوں اور ناولوں کے علاوہ انھوں نے تنقیدی موضوعات پر بھی اظہار خیال کیا۔ ان کے ترجمے بھی مقبول ہوئے۔ وہ ایک ناول نگار کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد انھوں نے پاکستان کی شہریت حاصل کر لی۔ پھر وہاں سے وہ کناڈا چلے گئے۔ ان کی وفات وہیں ہوئی۔

عزیز احمد کا پہلا ناول 'ہوس' 1937 میں منظر عام پر آیا۔ 'گریز'، 'ایسی بلندی ایسی پستی'، 'آگ' اور 'شبنم' ان کے دیگر اہم ناول ہیں۔ 'رقصِ ناتمام'، 'بیکار دن بیکار راتیں'، اور 'تیری دلبری کا بھرم' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ عزیز احمد نے 'ترقی پسند ادب' اور 'اقبال نئی تشکیل' نام کی کتابیں بھی لکھیں۔

عِصمت چغتائی (1991-1915): ان کی پیدائش جودھ پور، راجستھان میں ہوئی۔ ان کا بچپن جے پور اور آگرہ میں گزرا۔ وہیں انھوں نے ابتدائی تعلیم پائی۔ بی۔اے۔ اور بی۔ایڈ۔ کی ڈگریاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ انھوں نے مختلف اسکولوں میں ملازمت بھی کی۔ ممبئی میں مدارس کی انسپکٹریس بھی رہیں۔ پھر فلمی دنیا سے وابستہ ہوگئیں۔ ان کی ذہنی تربیت ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر ہوئی۔ مسلم گھرانوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کے طرزِ زندگی اور نفسیات پر ان کی گہری نظر تھی۔ انھوں نے ممبئی ہی میں وفات پائی۔

عصمت چغتائی نے ناول، افسانے اور رپورتاژ لکھے۔ انھیں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت ملی۔ 'دو ہاتھ'، 'چھوئی موئی'، 'کلیاں' اور 'چوٹیں' ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ 'ضدّی'، 'ٹیڑھی لکیر'، 'معصومہ'، 'سودائی' اور 'ایک قطرۂ خون'

ان کے اہم ناول ہیں۔ انھیں عورتوں کی زبان اور محاورات کے استعمال میں مہارت حاصل تھی۔ عصمت نے کچھ خاکے بھی لکھے۔ ان میں 'دوزخی' بہت مشہور ہوا جو انھوں نے اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی پر لکھا تھا۔ 'بمبئی سے بھوپال تک' ان کا ایک یادگار رپورتاژ ہے۔ عصمت کی تحریروں کی خاص پہچان ان کی طنز آمیز زبان ہے جس میں نشتریت اور بے باکی پائی جاتی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی (1984-1915) : بیدی لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ بچپن ہی سے انھیں قصّے اور کہانیاں پڑھنے اور لکھنے کا شوق تھا۔ انھوں نے کچھ عرصے تک ڈاک خانے میں اور پھر ریڈیو میں ملازمت کی۔ تقسیمِ ملک کے بعد وہ لاہور سے دہلی چلے آئے پھر کچھ دنوں تک جمّوں ریڈیو اسٹیشن سے منسلک رہے۔ اس کے بعد وہ ممبئی میں فلموں سے وابستہ ہو گئے۔

بیدی کا اصل میدان افسانہ نگاری ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے 'گرہن'، 'کوکھ جلی'، 'دانہ و دام' اور 'اپنے دکھ مجھے دے دو' مشہور ہیں۔ زندگی کے چھوٹے موٹے واقعات ان کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔ انسانی زندگی کی تہہ میں اتر کر اس کی نفسیات کا راز پا لینے میں بیدی کو کمال حاصل تھا۔ ایسے افسانوں میں، 'زین العابدین'، 'گرہن'، 'کوکھ جلی'، اور 'لاجونتی' کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ بیدی زندگی کے تاریک گوشوں میں محبت، ہمدردی اور انسانیت کی کرن دیکھ لیتے تھے جس کی عکاسی 'گرم کوٹ'، 'من کی من میں'، 'دس منٹ بارش میں' وغیرہ افسانوں میں ملتی ہے۔ بچوں کی نفسیات پر 'تلادان' اور 'بھولا' ان کے بہترین افسانے ہیں۔ انھوں نے افسانوں میں عورت کے کردار کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ 'ایک چادر میلی سی' ان کا مشہور ناولٹ ہے۔

احمد ندیم قاسمی (2006-1916) : قاسمی ضلع شاہ پور (پاکستان) کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم آبائی گاؤں میں ہوئی۔ 1935 میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے انھوں نے بی۔اے۔ کی ڈگری حاصل کی۔ رسالہ 'تہذیبِ نسواں' اور 'پھول' کی ادارت کی۔ انھوں نے 'فنون' کے نام سے ایک سہ ماہی جریدہ جاری کیا جس کے وہ آخر وقت تک مدیر رہے۔ ان کا انتقال لاہور میں ہوا۔

احمد ندیم قاسمی بیک وقت افسانہ نگار، شاعر اور صحافی بھی تھے۔ ان کے کئی افسانوی اور شعری مجموعے شائع ہوئے۔ ادبی مضامین اور اخباری کالم نویسی کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا۔ انھوں نے سب سے زیادہ شہرت اپنے

افسانوں کی وجہ سے پائی۔ ان کے افسانوں میں پنجاب کی دیہی زندگی اور عام انسانوں کے مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک سے بھی وابستہ رہے۔ 'چوپال'، 'بگولے'، 'گرداب'، 'آنچل' اور 'طلوع وغروب' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔

بلونت سنگھ (1921-1986) : وہ ضلع گوجراں والا میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول میں ہوئی۔ دہرہ دون کے کیمبرج اسکول سے انھوں نے میٹرک کیا۔ کرسچین کالج الہ آباد سے انٹر اور الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ کرنے کے بعد معاش کی تلاش میں لاہور اور کراچی بھی گئے۔ دہلی میں رسالہ 'آج کل' کے نائب مدیر رہے۔ بلونت سنگھ نے الہ آباد سے اردو میں 'فسانہ' اور ہندی میں 'اردو ساہتیہ' کے نام سے دو رسالے بھی جاری کیے۔ ان کا انتقال الہ آباد میں ہوا۔

بلونت سنگھ نے کئی طویل اور مختصر ناول لکھے۔ 'رات چور اور چاند' اور 'چک پیراں کا جسّا' ان کے نمائندہ ناول ہیں۔ 'جگّا'، 'تارو پود'، 'ہندوستان ہمارا'، 'پہلا پتھر' اور 'سنہرا دیس' ان کے افسانوں کے اہم مجموعے ہیں۔ بلونت سنگھ نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں پنجاب کی دیہی زندگی کا جیتا جاگتا نقشہ کھینچا ہے۔

خدیجہ مستور (1927-1982) : خدیجہ مستور کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی۔ ان کا پہلا افسانہ 'پہیا' 1941 میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے افسانے مؤقر رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ خدیجہ مستور کے افسانے 'جوانی'، 'موہنی'، 'یہ بڈھے'، 'یہ ہم ہیں'، 'لاشیں'، 'پتنگ' وغیرہ بہت مقبول ہوئے۔ 'چند روز اور'، 'تھکے ہارے' اور 'ٹھنڈا میٹھا پانی' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ آزادی کی تڑپ، غریبی و محرومی اور جنسی گھٹن ان کے خاص موضوعات ہیں۔ وہ ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ آزادی کے بعد وہ پاکستان منتقل ہو گئیں۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ 'آنگن' ان کا مشہور ناول ہے۔

رتن سنگھ (پ۔1927): رتن سنگھ ضلع سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ وہیں انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ ملک کی تقسیم کے بعد دہلی چلے آئے اور کچھ عرصہ لکھنؤ میں بھی رہے۔ 1969 میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'پہلی آواز' منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے جن میں 'پنجرے کا آدمی'، 'مانک موتی'، 'کاٹھ کا گھوڑا' اور 'پناہ گاہ' شامل ہیں۔ 'صبح کی پری' بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ انھوں نے مختصر ترین کہانیاں لکھی ہیں جو ایک منفرد پہچان رکھتی ہیں۔ 'سانسوں کا سنگیت' ان کا ناول ہے۔ انھوں نے دوہے بھی لکھے ہیں۔

رتن سنگھ کی ادبی خدمات کے اعتراف میں کئی اردو اکادمیوں اور تنظیموں نے انھیں اعزازات پیش کیے ہیں۔ انھوں نے اردو میں بعض پنجابی افسانوں اور ناولوں کے ترجمے بھی کیے۔ رتن سنگھ کا تعلق ادیبوں کی اس نسل سے ہے جو ترقی پسند تحریک کے ساتھ ذہنی اور نظریاتی وابستگی رکھتی ہے۔

ہاجرہ مسرور (1929-2012) : ہاجرہ مسرور لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ان کا پہلا افسانہ 'لاوارث لاشیں' تھا۔ان کا مشہور افسانہ 'بندر کا گھاؤ' ساقی میں 1944 میں شائع ہوا۔'اوپر تلے'، 'تِل اوٹ پہاڑ'، 'نیلم'، 'میرا بھیّا' وغیرہ سے ادبی حلقوں میں انھوں نے خاصی شہرت حاصل کر لی۔ان کے افسانوں میں سماجی مسائل پر تیکھا طنز ملتا ہے۔

ہاجرہ مسرور کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'چرکے' ہے۔اس میں شامل افسانے عورتوں کی مظلومیت اور بے بسی کی داستان بیان کرتے ہیں۔'ہائے اللہ'، 'چوری چھپے'، 'اندھیرے اجالے'، 'تیسری منزل' اور 'چاند کی دوسری طرف' ان کے دیگر مجموعے ہیں۔

قاضی عبدالستّار (1930/33-2018) : قاضی عبدالستّار، ضلع سیتا پور (اترّ پردیش) میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم سیتا پور اور اعلیٰ تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے بہ حیثیت استاد وابستہ رہے اور وہیں سے سبک دوش ہوئے۔

قاضی عبدالستّار نے ناول اور افسانے لکھے۔تاریخی ناولوں کی وجہ سے انھیں مقبولیت حاصل ہوئی۔ انھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں جاگیردارانہ اقدار و ماحول کو احساسِ تفاخر کے ساتھ پیش کیا۔'پہلا اور آخری خط'، 'شب گزیدہ'، 'غبارِ شب'، 'صلاح الدین ایوّبی'، 'دارا شکوہ'، 'غالب' اور 'خالد بن ولید' وغیرہ ان کے خاص ناول ہیں۔'پیتل کا گھنٹا'، 'رضو باجی'، 'ٹھاکر دوار' ان کے مشہور افسانے ہیں۔ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے انھیں 'پدم شری' کا خطاب دیا۔ انھیں غالب ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا گیا۔

جیلانی بانو (پ۔1936) : ان کا اصل وطن بدایوں (اتر پردیش) ہے۔ان کے والد حیدر آباد جا کر بس گئے تھے۔وہیں ان کی پیدائش اور تعلیم و تربیت ہوئی۔'روشنی کے مینار'، 'نروان' اور 'نُن' اُن کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔انھوں نے کئی ناولٹ بھی لکھے جن میں 'جگنو اور ستارے' اور 'نغمے کا سفر' نمایاں ہیں۔ان کے دو ناول 'ایوانِ غزل' اور 'بارشِ سنگ' بہت مقبول ہوئے۔

جیلانی بانو کے افسانوں اور ناولوں کا اصل موضوع حیدر آباد کے بعض جاگیرداروں کی بکھرتی ہوئی زندگی ہے۔وہ حیدر آباد کی مخصوص بولی کا استعمال بھی بڑی چابک دستی سے کرتی ہیں۔کئی ادبی اداروں نے انھیں اعزازات اور انعامات سے نوازا ہے۔

ترقی پسند دور کے دوسرے نمائندہ فکشن نگار

ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں ایک ایسی نسل بھی پروان چڑھ رہی تھی جس نے روشن خیالی کی بنیادوں کو مضبوط کیا اور ایسا ادب تخلیق کیا جس میں ضمیر کی آزادی کو ترجیح دی گئی تھی۔ یہ نسل نئے اسالیب اور نئی تکنیکوں کی طرف متوجہ تھی اسی لیے اس کے یہاں تازہ کاری بھی پائی جاتی ہے۔ اس طرح نئی فکر اور نئے لب و لہجے کے ساتھ اردو افسانے نے ایک نئی کروٹ لی۔ نئی جمالیاتی و نفسیاتی بصیرت نے اردو افسانے کو نئی بلندیوں اور وسعتوں سے آشنا کیا۔ اس دور کے ممتاز فکشن نگاروں میں منٹو، انتظار حسین اور قرۃ العین کے نام شامل ہیں۔

منٹو (1912-1955) : سعادت حسن منٹو لدھیانہ کے گاؤں سرالہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم امرتسر میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ علی گڑھ بھی گئے لیکن زیادہ دنوں تک تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور جلد ہی ملازمت اختیار کر لی۔ اخبار 'مساوات' (امرتسر) اور ہفت روزہ 'مصوّر' (ممبئی) میں بھی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ آل انڈیا ریڈیو کے لیے ریڈیائی ڈرامے اور فیچر لکھے۔ بعد میں وہ ممبئی میں فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے۔ تقسیم وطن کے بعد انھوں نے لاہور میں سکونت اختیار کر لی۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔

منٹو کو اردو کا بڑا افسانہ نگار مانا جاتا ہے۔ موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے ان کے افسانے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ 1936 میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'آتش پارے' شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے متعدد افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ 'نیا قانون'، 'ٹھنڈا گوشت'، 'کالی شلوار'، 'ٹوبہ ٹیک سنگھ'، 'موذیل' اور 'ہتک' ان کے اہم اور مشہور افسانے ہیں۔ انھوں نے افسانوں کے علاوہ ریڈیو ڈرامے، فیچر، مضامین، خاکے اور کئی فلموں کے اسکرپٹ بھی لکھے۔ 'گنجے فرشتے' ان کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔

انتظار حسین (1922/25-2016) : انتظار حسین اتر پردیش، ضلع بلند شہر اتر پردیش کے قصبہ ڈبائی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ انھوں نے ہاپوڑ سے ہائی اسکول اور میرٹھ کالج سے اردو میں ایم۔ اے۔ کیا۔ وہ شروع سے ہی صحافی بننا چاہتے تھے۔ 1947 میں پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد وہ کئی اخبارات و رسائل سے منسلک رہے۔ ان میں 'امروز'، 'آفاق'، 'مشرق'، 'نظام'، 'نوائے وقت' شامل ہیں۔ انھوں نے ایک ادبی رسالہ 'خیال' بھی نکالا لیکن وہ جلد ہی بند ہو گیا۔ انتظار حسین کچھ دنوں تک 'ادبِ لطیف' لاہور کے مدیر بھی رہے۔

انتظار حسین کے افسانوں میں داستانی رنگ پایا جاتا ہے لیکن انھوں نے اپنے افسانوں میں اساطیری روایات کو بھی عصری تناظر میں پیش کیا ہے۔ ان کا پہلا افسانہ 'قیوما کی دکان' تھا۔ افسانوں کے پہلے مجموعے 'گلی کوچے'، کے بعد 'کنکری'، 'آخری آدمی'، 'شہرِ افسوس'، 'چیشمے سے دور'، 'خالی پنجرہ' اور 'شہرزاد' کے نام سے ان کے دوسرے مجموعے شائع ہوئے۔ 'چاند گہن'، 'بستی'، 'دن اور داستان'، 'تذکرہ' اور 'آگے سمندر ہے' ان کے مشہور ناول ہیں۔ انھوں نے کچھ معروف کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں اور حکیم اجمل خاں کی سوانح حیات 'اجملِ اعظم' کے نام سے لکھی۔ ان کے دو تنقیدی مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

قرۃ العین حیدر (1926/27-2007) : قرۃ العین حیدر کا وطن نہٹور، ضلع بجنور ہے۔ ان کے والد کا نام سید سجاد حیدر یلدرم اور والدہ کا نام نذر سجاد حیدر تھا۔ ان کے والد اردو کے معروف ادیب ہیں۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ پھر دہلی یونیورسٹی سے بی۔ اے اور لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا۔ جدید انگریزی ادب، صحافت اور آرٹ (مصوری) کی تعلیم انھوں نے لندن میں حاصل کی۔

قرۃ العین حیدر نے مختلف سرکاری محکموں اور نجی اداروں میں ملازمت کی۔ وزارتِ اطلاعات ونشریات، پاکستان میں وہ انفارمیشن آفیسر رہیں۔ ہندوستان آنے کے بعد اخبار 'امپرنٹ' کی مینجنگ ایڈیٹر بن گئیں، وہ 'السٹریٹیڈ ویکلی' سے بھی وابستہ رہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملّیہ اسلامیہ، دہلی میں اردو کی وزیٹنگ پروفیسر تھی۔ انھوں نے امریکہ کی پانچ مشہور یونیورسٹیوں میں لکچر بھی دیے۔ انھیں مختلف اعزازات کے علاوہ حکومتِ ہند کی جانب سے 'پدم شری' اور 'پدم بھوشن' نیز ملک کا سب سے بڑا ادبی اعزاز 'گیان پیٹھ ایوارڈ' اور 'اقبال سمّان' بھی دیا گیا۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں انھیں 'سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ' برائے تراجم بھی ملا تھا۔

قرۃ العین حیدر نے اردو میں چار افسانوی مجموعے، چھے ناولٹ، نو ناول اور کئی رپورتاژ اور سفرنامے یادگار چھوڑے ہیں۔ انھوں نے کئی کتابیں مرتب بھی کیں۔ انھوں نے انگریزی اور دوسری زبانوں سے اردو میں اور اردو سے انگریزی میں متعدد ترجمے بھی کیے۔ ان میں بچّوں کے لیے انگریزی کہانیوں کے تراجم بھی شامل ہیں۔

قرۃ العین حیدر کی نظر میں بڑی وسعت اور فن میں گہرائی تھی۔ جیمس جوائس اور ورجینیا وولف جیسے نامور مغربی ادیبوں کا اثر ان کے یہاں بہت واضح نظر آتا ہے۔ ان کے کردار شعور کی رو کے سہارے ماضی کی بے کراں

وسعتوں میں سفر کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ناول 'آگ کا دریا' میں ہندوستان کی ہزاروں برسوں پر پھیلی تہذیب اور فلسفے کو بڑی مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کا مشاہدہ گہرا ہے اور عام طور پر انھوں نے اپنی کہانیوں میں اعلیٰ طبقے ہی کو توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ ان کے افسانوں کے موضوعات وغیرہ منفرد ہوتے ہیں۔ تاریخ اور جغرافیہ سے لے کر سماجیات، اخلاقیات، مذہب اور اساطیر کے عناصر تک ان کے افسانوں اور ناولوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی زبان سادہ، دل کش اور رواں ہے۔

'میرے بھی صنم خانے'، 'سفینۂ غمِ دل'، 'آگ کا دریا'، 'آخرِ شب کے ہم سفر'، 'گردشِ رنگ چمن' اور 'چاندنی بیگم' ان کے اہم ناول ہیں۔ 'کارِ جہاں دراز ہے' ان کا سوانحی ناول ہے۔ 'ستاروں سے آگے'، 'شیشے کے گھر'، 'پت جھڑ کی آواز' اور 'روشنی کی رفتار' قرۃ العین حیدر کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔

نمائندہ ترقی پسند تنقید نگار

ترقی پسند تحریک کے اثرات شعر و افسانہ کے ساتھ ادبی تنقید پر بھی مرتّب ہوئے۔ ترقی پسند تنقید نے مارکسی نظریۂ ادب کے تحت ادب اور زندگی کے سماجی اور فکری رشتے کی اہمیت کی طرف متوجہ کیا۔ ادب کا مقصد محض لطف اندوزی، حسنِ بیان نہیں ہے، زندگی کی تنقید اور زندگی کو ایک نئے معنی مہیا کرنا بھی اس کا ایک اہم مقصد ہے۔ ترقی پسند نظریۂ ادب ہر ایسے تصور کو مسترد کرتا ہے جس کی بنیاد ماضی پرستی پر قائم ہے۔ ترقی پسند تنقید نے ادب کو وقت کے تقاضوں کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے پر زور دیا۔ اس تصوّر پر اصرار کیا کہ انسانی شعور کی تشکیل میں سماج کے مادّی عناصر کا خاص دخل ہوتا ہے۔ زندگی ایک تغیّر پذیر حقیقت ہے، اسی معنی میں ادب میں بھی موضوعات اور اظہار کے طریقوں میں مختلف قسم کی تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔

مجنوں گورکھپوری (1904-1988) : مجنوں پلڈہ، ضلع بستی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر اور اعلیٰ تعلیم گورکھپور میں حاصل کی۔ ان کا شمار صفِ اوّل کے اُن ترقی پسند نقادوں میں ہوتا ہے جنھوں نے ترقی پسند فکر اور نظریۂ ادب کی ترویج و اشاعت میں حصّہ لیا۔ اُن کی ابتدائی تنقید پر تاثراتی رنگ غالب ہے۔ 'تنقیدی حاشیے' اور 'غزل سرا' کے مضامین اسی نوعیت کے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر مجنوں کے طرزِ فکر میں بھی تبدیلی واقع ہوئی۔ 'نقوش و افکار'، 'جمالیات' اور 'شوپنہار' ان کی معروف کتابیں ہیں۔ ترقی پسند تنقید کی تاریخ میں مجنوں کے تنقیدی مضامین کے مجموعے 'ادب اور زندگی' کو خاص مقام حاصل ہے۔

سجاد ظہیر (1905-1973) : سجاد ظہیر مچھلی شہر ضلع جونپور میں پیدا ہوئے۔ لندن میں دورانِ تعلیم ان کی ملاقات مُلک راج آنند اور دوسرے روشن خیال ہندوستانی نوجوانوں سے ہوئی۔ ان سبھی کی کوششوں سے ہندوستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔

سجاد ظہیر کی ادبی خدمات کے کئی پہلو ہیں۔ انھوں نے 'لندن کی ایک رات' نام کے ناولٹ کے علاوہ 'انگارے' کے نام سے ایک افسانوی مجموعہ بھی ترتیب دیا تھا۔ صحافت کے میدان میں بھی انھوں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ 'چنگاری'، 'نیا ادب'، 'عوامی دور' اور 'حیات' کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ 'روشنائی' ان کی اہم تصنیف ہے جو صرف ایک رپورتاژ ہی نہیں، ترقی پسند ادب وتحریک کے ارتقا کی ایک غیر رسمی تاریخ بھی ہے۔ 'اردو ہندی ہندوستانی' اور 'اردو کی جدید انقلابی شاعری' ان کے اہم تنقیدی مضامین ہیں۔

سجاد ظہیر کارل مارکس کے نظریات سے متاثر تھے۔ 'اردو کی جدید انقلابی شاعری' میں انھوں نے ایسے ہی شعرا کے کلام کا تجزیہ کیا ہے جو اشتراکی نظریات کے حامی تھے۔ سجاد ظہیر نے اپنی تصنیف 'ذکرِ حافظ' میں حافظ شیرازی کے ذہن وفکر کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ 'پگھلا نیلم' ان کی نثری نظموں کا مجموعہ ہے۔

سجاد ظہیر کا شمار ہندوستان کی ترقی پسند ادبی تحریک کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔ عالمی سیاسیات و اقتصادیات پر ان کی گہری نظر تھی۔ سجاد ظہیر ادب میں فکر وافادیت کی اہمیت کے ساتھ ساتھ جمالیاتی وفنی پہلو کی پاسداری کے بھی قائل تھے۔

عبدالعلیم (1905-1976) : عبدالعلیم غازی پور میں پیدا ہوئے۔ ان کی کتاب ایک چھوٹی کتاب ہے جس میں جدید رجحانات پر نظر ڈالی گئی ہے۔ یہ مضامین نظریاتی مباحث کے لحاظ سے اہم ہیں۔ تنقید پر ان کا سب سے اہم مضمون 'ادبی تنقید کے بنیادی اصول' ہے۔

عبدالعلیم ادب پاروں میں جمالیاتی پہلو کی اہمیت کے قائل ہیں۔ حُسن کے ساتھ خیر اور صداقت کی اقدار کو بھی انھوں نے خاص اہمیت دی ہے۔ ان کا بیشتر علمی کام اسلامیات سے متعلق ہے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔

احتشام حسین (1912-1972) : سیّد احتشام حسین رضوی کی پیدائش اعظم گڑھ کے ایک قصبے ماہُل میں ہوئی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ میں اور اعلیٰ تعلیم الہ آباد میں حاصل کی۔ احتشام حسین ایک بلند پایہ ترقی پسند

نقاد تھے۔ان کے تنقیدی نظریات میں مارکسزم اور سماجی تناظر کو مرکزیت حاصل ہے۔ان کا اصرار تھا کہ فن پارے کی تخلیق جس ماحول میں ہوئی ہے اس کا تجزیہ بھی اسی ماحول کے تناظر میں ہونا چاہیے۔ وہ ادب میں انفرادیت پر اجتماعی شعور کو ترجیح دیتے ہیں۔ان کے نزدیک ادیب و شاعر کا کام یہ نہیں کہ جو کچھ دیکھے، اسے جوں کا توں پیش کر دے بلکہ جو کچھ دیکھا اُسے کیسا ہونا چاہیے تھا، اس کی وضاحت کرنا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ 'تنقیدی جائزے'، 'روایت و بغاوت'، 'ادب اور سماج'، 'افکار و مسائل'، 'تنقید اور عملی تنقید'، 'ذوقِ ادب اور شعور'، 'عکس اور آئینے' اور 'اعتبارِ نظر' ان کے تنقیدی مجموعے ہیں۔ احتشام حسین نے ترقی پسند تنقید کو وقار عطا کیا۔ ان کی تنقید کو سائنٹفک تنقید کا نام بھی دیا گیا ہے۔

'اردو ادب کی تنقیدی تاریخ' اُن کی ایک اہم کتاب ہے۔'اردو کی کہانی' کے عنوان سے انھوں نے اردو زبان و ادب کی آسان تاریخ مرتّب کی ہے۔ احتشام حسین کا سفرنامہ 'ساحل اور سمندر' اور شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ان کے تراجم میں لسانیات کی کتاب 'اردو لسانیات کا خاکہ' بھی شامل ہے۔

اختر حسین رائے پوری (1912-1992): اختر حسین رائے پور، چھتیس گڑھ، میں پیدا ہوئے۔ ملازمت کے سلسلے میں کولکاتا، علی گڑھ اور دہلی میں بھی رہے۔ بعد میں ریاست حیدرآباد نے انھیں ایک گراں قدر وظیفے سے نوازا۔انھوں نے پیرس سے ڈی۔لٹ کی سند حاصل کی۔واپس آکر آل انڈیا ریڈیو اور پھر محکمۂ تعلیمات میں بہ حیثیت سکریٹری کام کیا۔ تقسیمِ وطن کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔انھوں نے اپنا کچھ وقت مہاتما گاندھی اور رابندر ناتھ ٹیگور کے ساتھ بھی گزارا تھا۔انگریزی، اردو لغت کی تالیف میں انھوں نے مولوی عبدالحق کی بڑی مدد کی۔

اختر حسین کے تنقیدی نظریات پر مارکسزم کا گہرا اثر ہے۔ وہ ادب کو زندگی کا ترجمان سمجھتے ہیں۔اختر حسین کے نزدیک ادب انسانی جذبات کو متاثر کرنے کا وسیلہ ہے۔ان کے خیال میں ادب سامانِ تفریح نہیں بلکہ سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔'ادب اور زندگی' ان کا اوّلین مضمون ہے جو رسالہ 'اردو' میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون ان کی اسی فکر کی ترجمانی کرتا ہے۔ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے 'ادب اور انقلاب' سے ان کے اشتراکی نظریات اور ترقی پسند تحریک کے ادبی میلانات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ان کی خودنوشت سوانح 'زادِ راہ' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

ممتاز حسین (1918-1992) : ممتاز حسین غازی پور میں پیدا ہوئے۔ تقسیمِ وطن کے بعد وہ کراچی منتقل ہو گئے۔ممتاز حسین کے ادبی سفر کا آغاز ترقی پسند تحریک کے ساتھ ہوا۔اُس عہد میں جب کہ روایت شکنی کے نام پر ماضی کی ہر اعلیٰ اور مثبت قدر کو شک کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا، ممتاز حسین نے کلاسیکی یا ماضی کے ادب کو ازسرِ نو سمجھنے پر

زور دیا۔ 'رسالہ درمعرفتِ استعارہ' اور 'ماضی کے ادب العالیہ سے متعلق' جیسے مضامین میں انھوں نے اسی تصور کے تحت فکروفن کا جائزہ لیا ہے۔

ممتاز حسین کا شماران ناقدین میں ہوتا ہے جن کی ذہن سازی میں مارکسی فکر نے خصوصی حصّہ لیا تھا لیکن ان کا مطالعہ محض مارکسی فلسفے تک محدود نہیں تھا۔ مارکسی فلسفہ وفکر کے علاوہ مغربی کلاسیکی اقدارِفن سے بھی انھوں نے اپنے طرزِ استدلال کو استحکام بخشا۔ اسی کے پہلو بہ پہلو مشرقی اقدارِفن کا درجہ بھی ان کے نزدیک بہت بلند تھا۔ خسرو اور غالب پر لکھے ہوئے ان کے مضامین اور کتابوں میں بھی مطالعے کی یہی صورت نمایاں ہے۔ 'نقدِ حیات' اور 'ادب وشعور' ان کے معروف تنقیدی مجموعے ہیں۔

محمد حسن (1925/26-2010): محمد حسن مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے مرادآباد میں اور اعلیٰ تعلیم لکھنؤ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ لکھنؤ، علی گڑھ، دہلی اور کشمیر میں اردو کے استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ 1990 میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے پروفیسر کے عہدے سے سبک دوش ہوئے۔ محمد حسن کو ہندوستانی حکومت نے جواہر لعل نہرو فیلوشپ دی تھی جس کے دوران انھوں نے کئی بیرونی ممالک کا سفر کیا اور وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ اس فیلوشپ کے تحت انھوں نے 'انیسویں صدی میں شمالی ہند کے ادب کے فکری اسالیب' کے موضوع پر کام کیا جو انگریزی میں 'Thought Patterns of 19th Century of North India' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔

محمد حسن مارکسی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ شاعر اور ڈراما نگار بھی تھے۔ انھوں نے 'غمِ دل، وحشتِ دل' نام سے ایک ناول بھی لکھا۔ ان کا تنقیدی مزاج مغرب ومشرق دونوں کے امتزاج سے مرتب ہوا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے طرزِ تنقید میں توازن پایا جاتا ہے۔ وہ ہر اس تنقیدی زاویے کو مثبت تصور کرتے ہیں جو ادب فہمی کا شعور پیدا کرنے میں معاون ثابت ہو۔ وہ ادب میں جمالیاتی اقدار اور صحت مند افکار وتصورات کی کارفرمائی کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں ادب پارے کی تفہیم اقتصادیات، نفسیات، جمالیات، عمرانیات اور عصری تاریخ وتہذیب کے تناظر کے بغیر ممکن نہیں۔

'اردو ادب میں رومانوی تحریک'، 'عرضِ ہنر'، 'معاصر ادب کے پیش رَو'، 'دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر'، 'مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ'، 'ہندی ادب کی تاریخ'، 'ادبی سماجیات' وغیرہ ان کی اہم تصانیف ہیں۔ انھوں نے 'عصری ادب' کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ بھی جاری کیا تھا۔

قمر رئیس (1932-2009): ان کا اصل نام مصاحب علی خاں تھا۔ وہ شاہجہان پور میں پیدا ہوئے تھے اور وہیں انھوں نے بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ قمر رئیس نے اپنا ادبی سفر شاعری سے شروع کیا۔ اس کے بعد وہ تنقید کی

طرف مائل ہوئے۔ ان کا تحقیقی مقالہ 'پریم چند کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ' تھا جس پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے انھیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی، اردو میں پریم چند شناسی کے لحاظ سے پہلی مبسوط تصنیف ہے۔ پریم چند شناسی کے فروغ میں قمر رئیس کی کوششوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

قمر رئیس ترقی پسند نقاد ہیں۔ انھوں نے نظریاتی تنقید پر عملی تنقید کو ترجیح دی۔ افسانوی ادب ان کے مطالعے کا خاص میدان تھا۔ ان کے پہلے تنقیدی مضامین کے مجموعے کا نام 'تلاش و توازن' ہے۔ 'تنقیدی تناظر'، 'تعبیر و تحلیل' اور 'بیسویں صدی میں اردو افسانہ' ان کے تنقیدی مضامین کے دوسرے مجموعے ہیں۔

ترقی پسند دور کے دوسرے نمائندہ تنقید نگار

ترقی پسندی کے اس دور میں بعض ایسے نقاد بھی تھے جو پہلے ہی سے معروف ہو چکے تھے اور اپنی سمت کا تعین کر چکے تھے۔ بعض ایسے تنقید نگاروں کے ادبی سفر کا آغاز تقسیمِ وطن کے آس پاس ہوا جنھوں نے کسی خاص نظریے کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھا۔

کلیم الدین احمد (1983-1908/09): کلیم الدین احمد، پٹنہ، بہار میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی۔ انھوں نے سٹی ہائی اسکول سے میٹرک اور پٹنہ کالج سے ایم۔ اے کی سند حاصل کی۔ وہ مزید تعلیم کے لیے انگلستان گئے۔ وہاں سے واپس آ کر پٹنہ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر ہو گئے۔ بعد میں ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن کے عہدے پر مامور ہوئے۔ وہ بھاگلپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔

'اردو شاعری پر ایک نظر' اور 'اردو تنقید پر ایک نظر'، 'فن داستان گوئی' اور 'سخن ہائے گفتنی' کلیم الدین احمد کی اہم کتابیں ہیں۔ ان کی خودنوشت کا نام 'اپنی تلاش میں' ہے۔ وہ مغربی ادب کے تصورات سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے روایتی تنقید سے نہ صرف یہ کہ انحراف کیا بلکہ وہ اپنے نظریات میں بھی سخت واقع ہوئے تھے۔ ادب میں وہ سماجی اور معاشی سروکاروں کے قائل نہیں تھے۔ انھوں نے تاثراتی تنقید کے برخلاف اردو میں سائنٹی فک تنقید کی زبردست تائید کی۔

آلِ احمد سرور (2002-1911): سرور بدایوں میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی اور اردو میں ایم۔ اے۔ کرنے کے بعد وہ وہیں لکچرر ہو گئے۔ پھر رضا کالج کے پرنسپل ہو کر رام پور گئے۔ یہاں سے لکھنؤ یونیورسٹی چلے گئے اور وہیں مقیم رہے۔

'تنقیدی اشارے' ان کی ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے تنقیدی نظریات کو واضح کیا ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کی نثر شگفتہ اور دلچسپ ہے۔ سرؔور کا تنقیدی شعور بڑا پختہ تھا۔ متقدمین اور پیش رو ادبا و شعرا کی تخلیقات پر ان کے تنقیدی مضامین بڑے معیاری ہیں۔ انھوں نے اپنے بعض مضامین میں ادب اور پروپیگنڈا، ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی، ادب کا مقصد کیا ہے؟ وغیرہ مسائل پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ 'نئے پرانے چراغ'، 'تنقید کیا ہے، ادب اور نظریہ'، 'نظر اور نظریے' اور 'مسرت سے بصیرت تک' ان کی اہم تصانیف ہیں۔ ان کی خودنوشت کا نام 'خواب باقی ہیں' ہے۔ آلِ احمد سرور کی مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں 'اقبال سمّان' اور 'غالب ایوارڈ' کے علاوہ دیگر انعامات و اعزازات بھی دیے گئے۔

خورشید الاسلام (1919-2006/07) : خورشید الاسلام بجنور کے ایک گاؤں 'امری' میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے دہلی کے فتح پوری اسکول میں حاصل کی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم۔اے۔ کیا۔ بعد میں اسی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر مقرر ہوئے اور ترقی کر کے پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کے منصب پر فائز ہوئے۔ علی گڑھ کی ملازمت کے دوران ہی چند برس 'لندن اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز' سے بھی بہ حیثیت استاد وابستہ رہے۔ ان کی وفات علی گڑھ میں ہوئی۔

خورشید الاسلام صاحبِ طرز نثر نگار اور خوش فکر شاعر تھے۔ ان کے چار شعری مجموعے 'رگِ جاں'، 'شاخِ نہالِ غم'، 'جستہ جستہ' اور 'می رقصم' (نثری نظمیں) شائع ہو چکے ہیں۔

نثری تصانیف میں 'غالب۔ ابتدائی کلام' اور مضامین کا مجموعہ 'تنقیدیں' اہم ہیں۔ رالف رسل کے ساتھ مل کر انگریزی میں ان کی دو کتابیں 'تھری مغل پوئٹس' اور 'غالب: لائف اینڈ لیٹرس' شائع ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے قائم اور سوؔدا کے انتخابات بھی مرتّب کیے ہیں۔ خورشید الاسلام بہت شگفتہ اور تخلیقی نثر لکھتے تھے۔ ان کے تنقیدی مضامین میں بھی شگفتگی پائی جاتی ہے۔

حسن عسکری (1919-1978) : محمد حسن عسکری سراوہ، ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم میرٹھ میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے الٰہ آباد چلے گئے۔ وہاں سے انھوں نے انگریزی ادبیات میں ایم۔اے کیا۔

عسکری کی تصانیف میں ان کے افسانوں کے دو مجموعے 'جزیرے' اور 'قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے'، معروف ہیں۔ 'ستارہ یا بادبان'، 'آدمی اور انسان'، 'وقت کی راگنی'، 'تخلیقی عمل اور اسلوب' ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔ 'جھلکیاں' ان کے کالموں کا مجموعہ ہے۔ وہ ایک معروف مترجم بھی تھے۔

انگریزی اور فرانسیسی ادب پر عسکری کی گہری نگاہ تھی۔ ان کی زبان سلیس و سادہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بات کرنے کا وہ اچھا سلیقہ رکھتے ہیں۔ وہ ادب پاروں کا تہذیبی نقطۂ نظر سے بھی تجزیہ کرتے ہیں۔ اپنی عمر کے آخری حصّے میں انھوں نے اسلامی مفکروں کے تنقیدی نظریات کی طرف خاص توجہ کی اور انھیں کی روشنی میں ادب کو سمجھنے کی ترغیب دی۔

ممتاز شیریں (1924-1973): ممتاز شیریں میسور کی رہنے والی تھیں۔ تقسیم وطن سے قبل بنگلور ہی سے سہ ماہی رسالہ 'سوغات' ان کی ادارت میں جاری ہوا تھا۔ ان کے پاکستان چلے جانے کے بعد یہ رسالہ کراچی سے نکلنے لگا۔ 'سوغات' نے نئی نسل کی ذہن سازی کی۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جدیدیت سے قبل جدیدیت کے بعض تصورات کی طرف میراجی اور سوغات ہی نے متوجہ کیا تھا۔ ممتاز شیریں بنیادی طور پر افسانہ نگار تھیں۔ افسانے کے فن پر ان کی نگاہ گہری تھی اور سلسلے میں انھوں نے کئی تجربے کیے تھے۔ منٹو شناسی کے بنیاد سازوں میں ان کا اہم درجہ ہے۔ منٹو پر لکھی ہوئی ان کی تحریریں منٹو کے فکروفن پر لکھنے والوں کے لیے آج بھی مشعل راہ ہیں۔ 'منٹو؛ نوری نہ ناری' کے علاوہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'معیار' افسانے کی تنقید کے تعلق سے ایک انقلاب آفریں تصنیف ہے۔

ان کا مضمون ''تکنیک کا تنوع'' افسانے کی تنقید میں، ایک مستقل حوالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ 'اپنی نگریا' ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔